

## خواتین کے حقوق اور مسائل

اس عنوان کے تحت اشراق کے اگست ۲۰۱۲ کے شمارے میں فاضل محترم محمد عمار خان ناصر کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ فاضل مضمون نگار کو اللہ نے کم عمری میں ذہن رسماً عطا کیا ہے اور وہ مسئلہ کی گہرائی میں اتر کے اس کا حل ڈھونڈتے ہیں۔ ان کی نگارشات نے بالعموم اور ”توہین رسالت“ پر ان کے مضمون نے بالخصوص میرے دل و دماغ پر ان کے علم و فضل کا نقش بٹھا دیا ہے۔ زیر نظر مضمون پر بحیثیت مجموعی میں ان کی اس سوچ سے متفق ہوں کہ مرد اور عورت کے درمیان اللہ نے تقویٰ اور اعمال صالحہ کا معیار قائم کیا ہے اور یہ کہ محض مرد ہونے کے ناطے سے مرد کو کوئی فضیلت نہیں۔ ان کے قول کے مطابق دو چیزیں ایسی ہیں جن میں مردوں اور عورتوں کے درمیان فرق روا رکھا گیا ہے۔ یعنی ان میں مرد کو صرف مرد ہونے کے اعتبار سے برتری ہے۔ میں صرف ان دو چیزوں کے بارے میں اپنی گزارشات پیش کروں گا۔

سب سے پہلے سورہ نساء کی آیت ۳۴ ہے:

الرِّجَالُ قَوُّمُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَالصَّالِحَاتُ قَنَاطٌ حَفِظَتْ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ.

آیت مبارکہ کو ہمارے مذہبی پیشوا عورت پر مرد کی مطلق فضیلت کے سلسلہ میں نص قطعی تسلیم کرتے ہیں اور اسی سوچ کے تحت اس کا اردو ترجمہ کرتے ہیں۔ فاضل محترم اس سوچ کی تائید تو نہیں کرتے مگر کہتے ہیں کہ ”اللہ تعالیٰ نکاح کے رشتے میں یہ چاہتے ہیں کہ مرد ایک بالادست شریک کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرے جبکہ عورت اس کے سامنے فرماں برداری کا رویہ اختیار کرے۔“ میں ایسا نہیں سمجھتا، کیوں؟

آیت مبارکہ کے تین الفاظ: قَوْمُونَ، بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ، اور قَتَلْتُمْ، تشریح طلب ہیں۔

اردو کے زیادہ تر مفسرین نے اَلرِّجَالُ، اور اَلنِّسَاءُ، کا ترجمہ مرد اور عورت کیا ہے نہ کہ میاں بیوی۔ غالباً وہ 'اَلرِّجَالُ، اور اَلنِّسَاءُ، سے پہلے 'ال، کو جنس کا تصور کرتے ہیں میرے خیال میں اس کا ترجمہ میاں بیوی صحیح ہے کیونکہ آیت کا شان نزول اور سیاق و سباق اس بات کی تائید کرتا ہے۔ عام مرد اور عام عورتیں ترجمہ کرنے سے ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی جن کا جواب دینا ممکن نہ ہوگا۔

قَوْمُونَ: اس کا ترجمہ 'حاکم' نہ لغوی طور پر مناسب ہے نہ معنوی طور پر۔

لغوی پہلو: قَوْمُونَ، جمع ہے قوم کی جو قیام سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کا مادہ قوم ہے۔

احمد بن فارس کی مقابیس اللغۃ میں ق + و + م کے دو بنیادی معنی ہیں پہلا لوگوں کی جماعت اور دوسرا کھڑا ہونا یا عزم کرنا۔ پہلے کو قیام حتم اور دوسرے کو قیام عزم کہتے ہیں۔ اس مادے کا فعل قَامَ، حرف جار (preposition) 'ب'، 'ل'، 'عَلَى' اور 'مَنْ' سے مل کر مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس طرح انگریزی زبان میں preposition لگنے سے یا تو معنی میں تخصیص ہو جاتی ہے یا معنی بالکل بدل جاتے ہیں بعینہ اسی طرح عربی زبان میں بھی صلہ (preposition) لگنے سے یا تو معنی کی تخصیص ہو جاتی ہے یا معنی بالکل بدل جاتے ہیں مثلاً قَامَ ب' اس نے کام کا ذمہ لیا قَامَ ل'، وہ کسی کے احترام میں کھڑا ہوا۔ قَامَ عَلَى' اس نے خیال رکھا۔ قَامَ الی' وہ گیا اور قَامَ مِنْ نومہ، وہ بیدار ہوا۔ لفظ قوام میں مطلقاً بھی حفاظت اور معاشی کفالت کے معنی موجود ہیں۔ جوہری نے صحاح میں عربی کا محاورہ بیان کیا ہے 'فَلان قوام اهل بیتہ و قیام اهل بیتہ' یعنی فلاں شخص اپنے گھر والوں کی ضروریات کو پورا کرنے والا ہے۔ بالکل انہی معنوں میں اس بات کی مصدر قیام قرآن کریم میں دو جگہ استعمال ہوئی ہے۔ ایک تو سورہ نساء کی آیت ۵ میں اللہ کا ارشاد ہے: "اور تم کم عقلوں کو ان کا وہ مال نہ دو جسے اللہ نے تم لوگوں کے لیے سبب معیشت (قیام) بنایا ہے۔" دوسرے سورہ مائدہ کی آیت ۹۷ میں ارشاد ہے "اللہ تعالیٰ نے کعبہ عزت والے گھر کو لوگوں کے لیے قیام یعنی مایہ زندگی (maintenance) بنایا ہے۔" اہم بات یہ ہے کہ زیر نظر آیہ مبارکہ میں قَوْمُونَ، کا لفظ 'علی' کے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔ عربی کی کم و بیش ساری بڑی لغات میں مرد اور عورت یا میاں بیوی کی تخصیص کے ساتھ ایک محاورہ بیان کیا گیا ہے کہ قَامَ الرَّجُلُ عَلَى الْمَرَاةِ، اور اس کے معنی ہیں 'مانہا' مرد نے عورت کو یا میاں نے بیوی کو روزی مہیا کی۔

لسان العرب نے یہ محاورہ بیان کرنے کے بعد الرجال قوامون علی النساء، کو بطور حوالہ پیش کیا ہے۔

تاج العروس نے اس محاورے اور مقام علیہا، کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں 'مآنہا و قام بشانہا متکفلاً' بامرہا، یعنی اس مؤنث کو روزی مہیا کی اور اس کی کفالت کرتے ہوئے اس کی حالت کو قائم کیا۔ اور قوام لہا، کے معنی ہیں 'مائن لہا'۔ روزی فراہم کرنے والا۔

ہوسکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ صرف عربی لغت کی رو سے قرآنی الفاظ کے معنوں کا تعین درست نہیں میں نے پہلے بھی داخلی شہادت کے طور پر قرآن کی دو آیات کو پیش کیا ہے۔ لفظ 'قَوِّمُوْنَ' زیر نظر آیت کے علاوہ قرآن کریم کے دو اور مقامات پر نصی حالت یعنی 'قَوِّمِیْنَ' کی شکل میں وارد ہوا ہے۔ اور 'ب' اور 'ل' کے حرف جار کے ساتھ آیا ہے۔ سورہ نساء کی آیت ۱۳۵ 'كُونُوا قَوِّمِينَ بِالْقِسْطِ' انصاف کے محافظ اور نگران بن جاؤ۔ اور سورہ مائدہ کی آیت ۸ 'كُونُوا قَوِّمِينَ لِلَّهِ' اللہ کے لیے قائم رہنے والے ہو جاؤ۔ قرآن میں کسی جگہ بھی 'قَوِّمُوْنَ' مطلقاً حاکم کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ مالی کفالت کے معنوں کی تائید بما انفقوا من اموالہم کے جملے سے بھی ہوتی ہے۔ "کیونکہ وہ اپنے مال سے خرچ کرتے ہیں۔"

مولانا آزاد نے 'قَوِّمُوْنَ' کا اردو ترجمہ یوں کیا ہے "مرد عورتوں کی زندگی کے بندوبست کرنے والے ہیں۔" مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی مالی کفیل کے ترجمہ کی تائید کی ہے لیکن ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ یہ معنی مرد کی برتری کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں جس پر تبصرہ بعد میں ہوگا۔

مولانا احمد علی لاہوری نے یوں ترجمہ کیا ہے کہ "مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں۔"

سوال یہ ہے کہ عربی کے قدیم مفسرین نے 'قَوِّمُوْنَ' کا ترجمہ 'تسلطون' اور 'مسیطرون' کیوں کیا؟

اس سے حاکم کا تصور ابھرا ہے۔ عورت کے بارے میں وہ اسرائیلی روایات سے متاثر ہیں۔ چنانچہ وہ عورت کو برائی کی جڑ مانتے ہیں اور مرد کو نیکی کا سرچشمہ اور یہ کہ خدا نے آدم کو بہکایا اور سانپ والا قصہ بھی بیان کرتے ہیں یہ سب کچھ قرآنی ہدایات کے منافی ہے مگر ان کی تفسیروں میں موجود ہے۔ میں نے قرآنی آیت 'خلق لکم ما فی الارض جمیعاً' کے ضمن میں امام رازی کے پایہ کے مفسر کے عورت کے بارے میں خیالات پڑھے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لفظ حاکم کی سند کے لیے میں کتاب مقدس (Bible) کے باب تکوین (Genesis) کا حوالہ پیش کرتا ہوں:

"To the woman he said: I will greatly multiply your sorrow your conception: pain ..... you shall bring forth children your desire shall be for your husband and he shall rule over you." (3:16)

یہ اللہ کے الفاظ ہیں اور سانپ والے قصے کا تسلسل گویا عورت کو جو حمل ٹھہرتا ہے اور درد سے جو وہ بچے جنتی ہے یہ

آدم کو بہکانے کی سزا ہے۔ فطری عمل نہیں اسی سزا کے طور پر وہ اپنے شوہر کے لیے تڑپتی رہتی ہے اور وہ اس پر حاکم ہو گا۔ یہ ہے لفظ حاکم کی سند۔ آیت زیر نظر کے تحت مفسرین نے عورت کی خامیوں کی اور مرد کی خوبیوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست دے ڈالی ہے گویا عورت برائی کی جڑ ہے اور مرد نیکی کا سرچشمہ اس لیے مرد محض مرد ہونے کے ناطے سے برتر ہے اور عورت محض عورت ہونے کے ناطے سے کم تر۔ اس میں اعمال صالحہ کا کچھ دخل نہیں۔

### معنوی پہلو

لغوی پہلو پر بحث کرنے کے بعد میں واضح کر چکا ہوں کہ لغوی طور پر قَوْلُ مُمْؤِنٌ کا ترجمہ حاکم اس آیت میں قطعی غیر موزوں ہے۔ معنوی طور پر میاں بیوی کے تعلقات حاکم و محکوم کے نہیں، بلکہ ایک ساتھی اور شریک حیات کے ہیں۔ جس میں ایک کی حکومت اور دوسرے کی فرماں برداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا حاکم و محکوم کے تعلق سے پیار، محبت، سکون اور اطمینان کی وہ فضا قائم رہ سکتی ہے جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے؟ ہاں رفاقت اور باہمی رضامندی اور مشورہ خاندانی نظام کا ضامن ہے۔ قرآن نے مرد اور عورت، میاں اور بیوی کے لیے بہت ہی خوب صورت لفظ زوج استعمال کیا ہے۔ مرد عورت کا زوج ہے اور عورت مرد کی زوج۔ زوجہ جیسا گھٹیا لفظ قرآن نے استعمال نہیں کیا۔ مرد عورت کے بغیر ناقص ہے اور عورت مرد کے بغیر دوکوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ لفظ زوج میں یکسانیت، ہم رنگی اور پیوستگی کے جو معنی پائے جاتے ہیں وہ فاضل مقالہ نگار کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوں گے۔ یہ دونوں اللہ کی اطاعت کرنے والے ایک دوسرے کے زوج ہیں۔ یہ مفہوم کہ مرد صرف حکومت کرنے کے لیے ہیں اور عورتیں مردوں کی فرماں برداری کے لیے، اس اعتبار سے غلط ہے کہ رفاقت ایک کی حکومت اور دوسرے کی فرماں برداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن نے بیوی کے لیے صاحبہ کا لفظ استعمال کر کے رفاقت کے تعلق کو واضح کر دیا ہے۔ اس تعلق کو مضبوط کرنے کے لیے قرآن نے 'عَنْ تَرَاضٍ' اور 'عَنْ تَشَاوُرٍ' (۲۳۳:۲) یعنی باہمی مشورہ اور باہمی رضامندی کی مفید نصیحت کی ہے۔ لغوی بحث میں میں نے اس کھینچا تانی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جس کی طرف فاضل محترم نے اپنے مضمون کے آغاز میں اشارہ کیا ہے۔

بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ آیت کا یہ لکڑا بھی تشریح طلب ہے، کیونکہ اس میں مرد کی مطلق فضیلت کو ثابت کرنے کے لیے اچھی خاصی کھینچا تانی کی گئی ہے۔ 'بَعْضُهُمْ' میں 'هُم' کی ضمیر واضح طور پر مردوں اور عورتوں کی طرف راجع ہے۔ اور صحیح ترجمہ یہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی

ہے یعنی کچھ باتوں میں مرد کو فضیلت ہے اور کچھ میں عورت کو مگر ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے، کیونکہ مرد پر عورت کی فضیلت ان کے ذہن سے لگا نہیں کھاتی۔ مرد کی جس فضیلت کا ذکر یہاں ہے اس کا تعلق صرف قومیت سے ہے یہ مطلق فضیلت نہیں۔ آیہ مبارکہ میں مرد اور عورت کی مطلق فضیلت کا مسئلہ زیر بحث نہیں ہے۔ اس کے فوراً بعد اللہ کا قول ہے وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ، اور کیونکہ وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں یعنی یہ فضیلت مالی کفالت سے تعلق رکھتی ہے اور بس۔

قرآن کریم نے مرد اور عورت یا میاں بیوی کے باہمی تعلقات کو بیان کرنے کے لیے کئی ایک مقامات پر بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ کی بلیغ ترکیب استعمال کی ہے۔ سورہ آل عمران میں ارشاد ہے: ”بے شک تم میں سے کسی شخص کے عمل کو اِکارت نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تم آپس میں ایک دوسرے کا جزو ہو۔“ (۱۹۵:۳) سورہ نساء میں ارشاد ہے: ”اور جو شخص تم میں آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی وسعت نہیں رکھتا تو وہ مومن باندیوں سے جو تمہارے زیر دست ہیں نکاح کر لے اور تمہارے ایمان کی پوری حالت اللہ ہی کو معلوم ہے۔ تم آپس میں ایک دوسرے کا جزو ہو۔“ (۲۵:۴) اس آیت میں بھی بلیغ ترکیب بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ استعمال ہوئی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کا جزو ہیں بالکل اسی طرح جس طرح بدن کے مختلف اعضا ہیں سب اعضاء کر بدن کی مصلحت کے لیے کام کرتے ہیں۔ اسی طرح مرد اور عورت مل کر سوسائٹی کی مصلحت کے لیے کام کرتے ہیں۔ سوسائٹی میں ایکے مرد یا ایکلی عورت کے لیے بقا ممکن نہیں۔

اللہ نے انسان کا ڈھانچہ تخلیق کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونکی۔ یہ روح جس طرح مرد کے ڈھانچے میں پھونکی گئی بالکل اسی طرح عورت کے ڈھانچے میں پھونکی گئی۔ روح سے مراد استعداد اور صلاحیت ہے۔ استعدادات کو عطا کرنے میں اللہ نے مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ تربیت اور ماحول کی وجہ سے یہ استعدادات گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہیں۔ آیہ مبارکہ میں جس فضیلت کا ذکر ہے اس سے مراد یہی استعداد اور صلاحیت ہے، یعنی بعض باتوں میں مرد کی استعداد اور صلاحیت زیادہ ہے اور بعض باتوں میں عورت کی استعداد زیادہ ہے۔ کسب رزق کی صلاحیت مرد میں اس لیے زیادہ ہے کہ اسے عورت کی مانند حمل، ولادت، رضاعت اور تربیت کے مراحل سے نہیں گزرنا پڑتا۔ اس کے پاس فارغ وقت بھی زیادہ ہوتا ہے اور مواقع بھی زیادہ، جبکہ عورت کے لیے اپنے فرائض منصبی کی وجہ سے کسب رزق مشکل ہے۔ اسی بات کو سید قطب نے ”فی ظلال القرآن“ میں بڑے خوب صورت الفاظ میں یوں بیان کیا ہے ”انصاف کا تقاضا تھا کہ مرد کے ذمے ضروریات زندگی کو فراہم کرنے کا کام سونپا جائے تاکہ

عورت فارغ ہو کر اپنے فرائض منصبی ادا کر سکے۔ یہ مناسب نہ تھا کہ وہ حمل، ولادت، رضاعت اور تربیت کا بوجھ بھی اٹھائے اور ضروریات زندگی بھی فراہم کرے۔“ جس خدانے عورت پر حمل، ولادت، رضاعت اور تربیت کا بوجھ ڈالا ہے، کیونکہ وہ اس کی استعداد رکھتی ہے اور اس استعداد میں وہ مرد سے افضل ہے اس خدانے مرد پر نان و نفقہ کا بوجھ ڈال کر حساب برابر کر دیا ہے۔

یہ قوامیت گھر کے اندر تقسیم کار کا ایک نظام ہے تاکہ خاندان حسن و خوبی سے چلتا رہے۔ اسے عمرانیات کے ماہر 'Instrumental guardianship' کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ معاشرتی نظام کا تقاضا ہے۔ یہ قوامیت گھر کے اندر ہے۔ اگر کسی دفتر اور ادارے کی سربراہ عورت ہے تو کیا اس میں کام کرنے والے مرد محض اس لیے اس کا حکم نہیں مانیں گے کہ اللہ نے قوامیت کا حق مرد کو دیا ہے اور جس کرسی پر وہ بیٹھی ہے وہ مرد کے لیے خالی کر دے۔ حضرت عمر نے شفا بت عبد اللہ عدویہ کو مدینے کے بازار کا نگران مقرر کیا۔ ان کا حکم مردوں اور عورتوں سب پر چلتا تھا۔

آئیہ کریمہ میں نہ تو مرد کی فطری برتری زیر بحث ہے نہ عورت کی فطری کہتری۔ یہ محض ایک گھریلو نظام کے بارے میں ہے۔ اس لیے اس سے مرد کی مطلق فضیلت کو اخذ کرنا درست نہیں۔

سید محمد قطب فرماتے ہیں: ”اس قوامیت کا مقصد عورت کی شان کو گھر کے اندر اور معاشرے میں گھٹانا نہیں یہ ایک خاندانی نظام ہے۔ اس میں شریک مرد اور عورت مستقل شخصیت کے مالک ہیں، دونوں کے حقوق یکساں ہیں۔ دوسرے مقامات پر اس قوامیت کے خدو خال کو واضح کیا گیا ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں سے کس قسم کا سلوک کرے۔“ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: ”کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ“ میاں بھی راعی نگرانی اور حفاظت کرنے والا ہے اور بیوی بھی، دونوں اپنی زیر کفالت لوگوں کے لیے جواب دہ ہیں۔ گھر کے نظم میں میاں اور بیوی کا اشتراک ہے۔ میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ صرف عورت ہی کی ہمت ہے کہ وہ اپنا فرض منصبی بھی ادا کرتی ہے اور رزق کی تلاش میں دوڑ دھوپ بھی کرتی ہے۔ دیہات میں کھیت کھلیان میں کام کرتی ہے، چارہ بناتی ہے اور گٹھا سر پراٹھاتی ہے، دود و تین تین کوس سے پانی کے دودو گھڑے سر پراٹھا کر لاتی ہے۔ شہروں میں سڑکوں پر روٹی کوٹی ہے سر پردس دس اینٹیں اٹھا کر تیسری منزل پر چڑھتی ہے، گھروں میں جھاڑ پونچھ کرتی ہے۔ یہ ہمت مرد میں کہاں؟ فضیلت تو اسے دینی چاہیے۔

آخر میں بحث کو سمیٹتے ہوئے تفسیر البحر المحیط میں امام قرطبی کے قول کا ذکر بے جا نہ ہوگا فرماتے ہیں: ”جمہور علما

نے اللہ کے قول **وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ** سے یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ اگر مرد نان و نفقہ کی ادائیگی سے عاجز آجائے تو وہ عورت کا محافظ یا نگران نہیں رہے گا اور جب معاہدے کی شرط ختم ہو جائے گی جس کی وجہ سے نکاح کو جواز ملا تو معاہدہ بھی ختم ہو جائے گا۔ نکاح کے ٹوٹنے کا ثبوت وہ تنگ دستی ہے جس کی وجہ سے وہ روٹی، کپڑا اور مکان مہیا نہ کر سکا۔ یہی امام مالک اور امام شافعی کا مذہب ہے۔“

آج کل ہمارے گھروں میں جو لڑکیاں کام کرتی ہیں ان کے والد اور شوہر اکثر و بیشتر نشہ کرتے ہیں اور کوئی کام نہیں کرتے۔ وہ لڑکیوں کی کمائی پر گزر اوقات کرتے ہیں۔ کیا وہ بھی قوامون ہیں اور عورتوں سے برتر ہیں۔  
**قُنْتٌ**؛ آیت کو سمجھنے کے لیے یہ لفظ بھی تشریح طلب ہے، کیونکہ اسرائیلی روایات کی روشنی میں عورت کے بارے میں دل و دماغ پر نقش خیالات کو ثابت کرنے کے لیے اس کے معنوں میں خاصی کھینچا تانی کی گئی ہے۔ فاضل محترم بھی اپنے ترجمے سے اس کھینچا تانی سے متاثر لگتے ہیں۔

مقائیس اللغۃ میں ہے کہ قننت، صرف اور صرف دین کے بارے میں اطاعت اور نیکی پر دلالت کرتا ہے۔ پھر دین کے راستے میں ہر استقامت کو قنوت کہا گیا۔ نماز میں طویل قیام اور سکوت کو بھی قنوت کہا گیا ہے۔

مفردات میں قنوت کے معنی خضوع کے ساتھ اطاعت کا التزام ہے، یعنی فروتنی، خشوع و خضوع اور دوام اس اطاعت کے عناصر ترکیبی ہیں۔ جس اطاعت میں یہ عناصر مفقود ہوں اسے قنوت نہیں کہا جاسکتا اسی لیے قرآن کریم میں یہ لفظ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے خاص ہے۔ کسی شخص کی اطاعت کے لیے اس کا استعمال جائز نہیں۔ اللہ کا قول ہے: **وَمَنْ يَفْعَلْ مِنْكُمْ خَيْرًا فَلْيَفْعَلْهُ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ** (۳۱:۳۳) ”جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرماں بردار ہیں۔“ بعض آیات میں اسے صرف اللہ کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، کیونکہ رسول کی اطاعت بھی دراصل اللہ کی اطاعت ہے۔ جیسے **قُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ** ”اللہ کے سامنے فرماں بردار بن کر کھڑے رہا کرو۔“ **كُلُّ لَّهُ قَانِتُونَ** (۱۱۶:۲) ”سب اس کے فرماں بردار ہیں۔“ اس آیت مبارکہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قنوت (فرماں برداری) صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ اور یہ حکم ساری کائنات کے لیے ہے۔ قرآن کریم میں یہ صفت مردوں کی بھی بیان کی گئی ہے اور عورتوں کی بھی، جیسے **إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا** (۱۲۰:۱۶) ”بے شک ابراہیم لوگوں کے امام اور اللہ کے فرماں بردار تھے۔“ پھر ارشاد ہے: **وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ** (۳۵:۳۳) ”فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں۔“ اگر عورتوں کو مردوں کی فرماں بردار کہا جائے تو مردوں کو بیویوں کا فرماں بردار کہنا چاہیے۔ حقیقت میں دونوں اللہ کے فرماں بردار ہیں۔ حضرت مریم کے بارے میں ارشاد ہے: **وَوَكَّأَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ** (۱۲:۶۶)

’اور وہ فرماں برداروں میں سے تھیں۔‘ یہاں دو باتوں کو مد نظر رکھا جائے ایک تو وہ بے شوہر تھیں۔ دوسرے اللہ نے ان کے بارے میں مذکر کا صیغہ استعمال کر کے مرد اور عورت کا فرق مٹا دیا ہے۔

اگر بیوی کا شوہر بدقماش ہو تو کیا اس کی بھی فروتنی کے ساتھ ہمیشہ اطاعت کی جائے گی؟ اور اس اصول کو بالائے طاق رکھ دیا جائے گا کہ ’لا طاعة فی معصية الخالق‘ خالق کی نافرمانی کر کے کسی کی فرماں برداری کا کوئی تصور نہیں۔ اس لیے صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ صالح عورتیں اللہ کی فرماں بردار ہیں اور بہت سچے مرد کے حقوق کی حفاظت کرنے والی ہیں، کیونکہ اللہ نے ان کی یا ان کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔

فاضل مقالہ نگار کی خدمت میں گزارش ہے کہ میں نے آیت کا ایک ایک لفظ پڑھا ہے مجھے تو کہیں بھی مرد بالادست نظر نہیں آتا، بلکہ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ سے اس سوچ کی تردید صاف نظر آرہی ہے۔ اب آتے ہیں سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۸ کی طرف وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ”مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ ہے۔“ دیکھنا یہ ہے کہ یہ درجہ مطلق ہے یا مقید۔ یہ درجہ فضیلت کا ہے یا ذمہ داری کا؟ فاضل محترم نے خود تسلیم کیا ہے کہ یہ درجہ گھر کے اندر مقید ہے اور مطلق نہیں۔ گھر گرہستی کے نظام کا اطلاق عام حالات پر نہیں ہوتا۔

امام ابن جریر طبری نے جامع البیان ۴: ۴۵۴ میں درجہ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ قول فیصل کا حکم رکھتا ہے پہلے وہ درجہ کے بارے میں مختلف آراء نقل کرتے ہیں، کسی نے اسے حق مہر کی ادائیگی کا درجہ کہا، مجاہد نے اسے دائرہ کی درجہ کہا، کسی نے جہاد اور میراث کا درجہ کہا، امام طبری عکرمہ کی روایت سے ابن عباس کا قول نقل کرتے ہیں جنہوں نے کہا: ’لا احب ان استنظف جميع حقى عليها لان الله تعالى قال للرجال عليهن درجة‘ ”میں نہیں چاہتا کہ عورت سے اپنے تمام حقوق حاصل کر لوں کیونکہ اللہ کا قول ہے کہ مردوں کو ان پر درجہ ہے۔“ امام طبری فرماتے ہیں کہ آیت کی تفسیر میں دوسرے اقوال کے مقابلے میں ابن عباس کا قول زیادہ مناسب اور مفید ہے۔ اس موقع پر اللہ نے جس درجہ کا ذکر کیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ مرد عورت پر اپنے حق کے کچھ حصے کو معاف کرے اور چشم پوشی سے کام لے اور اس کے تمام حقوق کو پورا کرے، کیونکہ اللہ نے ’لهنّ مثل الذی علیهن‘ کے فوراً بعد فرمایا ’للرجال علیهن درجة‘۔ اللہ تعالیٰ بتانا چاہتا ہے کہ مرد نہ تو تین طہر میں رجوع کرنے کے بعد اور نہ ہی دوسرے حقوق میں عورت کو ضرر پہنچائے اور عورت کو چاہیے کہ وہ نہ تو اپنے رحم میں بچے کو چھپا کر اور نہ ہی دوسرے حقوق میں مرد کو ضرر پہنچائے۔ اس کے بعد مردوں کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ اگر عورت سے کسی قسم کی کوتاہی ہو جائے تو وہ وسعت قلبی سے کام لیں اور یہی مقصد ہے ابن عباس کے قول کا۔

امام بیضاوی (۱۵۶:۱) نے درجہ سے مراد حق مہر اور نان و نفقہ کا درجہ لیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے مراد ترک ایذا ہے۔

ابن حبان اندلسی نے البحر المحیط (۲:۲۰۰) میں امام قرطبی کا قول نقل کیا ہے کہ ابن عباس کا قول اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عورت سے حسن سلوک کرنا چاہیے، نیز مال اور اخلاق میں وسعت قلبی سے کام لینا چاہیے یعنی فضیلت اس میں ہے کہ گراں باریوں کے باوصف مرد ذمہ دار یوں کا بوجھ اٹھائے۔

سید قطب فی ظلال القرآن (۱:۲۳۶) میں لکھتے ہیں ”میرا خیال ہے کہ یہ درجہ مقید ہے آیت کے سیاق کی رو سے اس سے مراد عدت کے دوران رجوع کا حق ہے۔“

ابن العربی نے احکام القرآن (۱:۱۸۸) میں یہ بات ذرا کھول کر بیان کی ہے ان کا قول ہے: ”درجہ کے بارے میں علما کی رائے کی وجہ سے کئی اقوال مروی ہیں... لیکن آیہ مبارکہ میں مطلق درجہ کا کوئی ذکر نہیں جس کی وجہ سے ہم عورتوں پر مردوں کی فضیلتیں گنوانے بیٹھ جائیں۔“

یہ درجہ مقید ہے اس لیے اللہ کے قائم کیے ہوئے فضیلت کے معیار پر یہ قطعی اثر انداز نہیں ہوتا۔

بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ درجہ مقید ہے اور ذمہ داری کا ہے نہ کہ فضیلت کا۔

حیران ہوں محترم مقالہ نگار نے اللہ کے قائم کیے معیار سے استثنا کی دوسری مثال وراثت کے حصہ کی دی ہے اور کہا ہے کہ مرد کا دگنا حصہ بھی مرد کی برتری ثابت کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔

زمانہ جاہلیت میں عورتوں اور بچوں کو اس لیے وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا کہ وہ قبیلے پر مالی لحاظ سے ایک بوجھ تھے۔ نہ غارت گری میں حصہ لیتے تھے اور نہ کوئی اور کمائی کرتے تھے چنانچہ لڑکیوں کو یا تو زمین میں دفن کر دیا جاتا تھا یا اون کا لمبا جغہ پہنا کر اونٹوں کے پیچھے لگا دیا جاتا تھا۔ اسلام نے عورت کو وراثت کا حصہ دے کر اسے اعزاز بخشا ہے اور حمل، ولادت اور رضاعت کی بھاری ذمہ داریوں کو ایک مفید کام سمجھ کر مرد کو ان کے نان و نفقہ کا ذمہ دار قرار دیا تاکہ وہ آرام سے اپنے فرائض منصبی ادا کر سکیں۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں اس حکمت کو بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ وجہ بیان کی ہے کہ ”عورت کو کم خرچ کرنا پڑتا ہے کیونکہ ان کے نان و نفقہ کا ذمہ دار مرد ہوتا ہے۔ مرد زیادہ خرچ کرتا ہے کیونکہ اپنے علاوہ اسے اپنے بیوی بچوں پر بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔“ امام صاحب نے اور بھی وجوہات بیان کی ہیں مگر سب سے زیادہ منطقی وجہ وہی ہے جسے انھوں نے پہلے نمبر پر بیان کیا ہے۔ مرد اپنے آپ پر بھی خرچ کرتا ہے اور اپنے بیوی بچوں پر بھی۔ اس لیے

اس کا حصہ دگنار رکھا گیا ہے۔ اس میں مرد کی برتری کا کوئی دخل نہیں۔ یہ ایک معاشی بندوبست ہے کیونکہ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد عورت کے پاس اتنا فارغ وقت نہیں ہوتا جتنا مرد کے پاس ہوتا ہے۔ عورت کے پاس جو مال حق مہر کی صورت یا جائیداد کی صورت میں ہوتا ہے وہ اسے اپنے گھر پر خرچ کرنے کی مکلف نہیں۔ اگر وہ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ کوئی ملازمت کرتی ہے تو اس کی تنخواہ پر بھی اس کے گھر والوں کو کوئی حق نہیں وہ جیسے چاہے اس میں تصرف کر سکتی ہے۔ مرد اس میں دخل دینے کا مجاز نہیں۔ اگر مالی ذمہ داریوں کو مد نظر رکھا جائے تو عورت کا حصہ مرد سے زیادہ ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ عادل بھی ہے اور حکیم بھی وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ جہاں مالی ذمہ داریوں کا مسئلہ نہ ہو وہاں عورت اور مرد کو برابر کا حصہ ملتا ہے مثلاً اگر مرنے والا صاحب اولاد ہو تو ماں اور باپ کو مساویانہ طور پر چھٹا حصہ ملے گا لیکن اگر اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ ملے گا اور باپ کو دو تہائی۔ باپ ہونے کی حیثیت سے اسے ایک تہائی ملے گا دوسرا تہائی اسے عصبہ ہونے کی صورت میں ملے گا نہ کہ باپ کی حیثیت سے، عصبہ ہونے کی حیثیت سے ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ اولاد کی موجودگی میں برابری اس لیے ہے کہ وہ ان کا برابر کا احترام کریں۔ مالی ذمہ داریوں کے پیش نظر ورثہ میں والدین کا حصہ اولاد سے کم ہے کیونکہ والدین کو اس عمر میں مال کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی وہ اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں۔ اول تو ان کے پاس اپنے گزارے کے لیے اثاثہ ہوتا ہے دوسرے ان کی اولاد پر ان کا نان و نفقہ واجب ہوتا ہے۔ رہی اولاد وہ یا تو اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ کما نہیں سکتے لیکن اگر بڑے ہوں تو بچوں کی تربیت اور شادی بیاہ کے لیے ان کو مال کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے ان کا حصہ والدین کے مقابلہ میں زیادہ رکھا گیا ہے۔ اسی طرح کلالہ (لا ولد متونی) کے ورثا میں بھی تذکیر و تانیث کا کوئی فرق نہیں۔ اگر اس کا ایک بھائی اور ایک بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر بھائی زیادہ ہوں تو ۱/۳ میں سب برابر کے شریک ہوں گے۔

اس طرح اسلام نے عورت کے فرائض منصبی کی قدر و قیمت (evaluate) کی ہے اور مرد پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ اس کے لیے روٹی، کپڑا اور مکان مہیا کرے اور اس کی ذاتی آمدنی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ ہاں عورت کی رضامندی سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ عورت کا حصہ ورثے میں بھی مقرر کر دیا ہے، ورثہ کی آیات میں عورت کے حصے کو بنیادی طور پر تسلیم کر کے مرد کے حصے کو اس پر قیاس کیا گیا ہے ارشاد ہے: 'لذکر مثل حظ الانثین'۔ یعنی عورتوں کا حصہ تو طے شدہ ہے مرد کا حصہ اس پر قیاس کر کے مقرر کیا جائے گا، کیونکہ زمانہ جاہلیت میں سارا حصہ مرد کو ملتا تھا، قرآن نے قرار دیا کہ اصل حصہ عورت کا ہے اس سے بڑھ کر عورت کی کیا عزت افزائی ہو

نقد و نظر

سکتی ہے؟ اور ہم چلے ہیں اس حصہ سے مرد کی برتری ثابت کرنے، برتری کا معیار وہی ہے جو اللہ نے مقرر کیا ہے یعنی تقویٰ اور اعمال صالحہ باقی سب شاذ و نادر (chauvinism) ہے۔ شکر ہے کہ فاضل محترم نے روایتی مذہبی پیشواؤں کی طرح شہادت اور دیت کو برتری کے لیے پیش نہیں کیا۔  
مجھے امید ہے نوجوان فاضل محترم جو گرجہ سے تھوڑا سا گلہ سن کر اس بوڑھے کے دلائل کی طرف دھیان دیں گے۔ شکر یہ۔

www.al-mawrid.org  
www.javedahmadghamidi.com